جامعة المصطفى العالمية
Al-Mustafa International University
مجتمع آموزش عالی قرآن و حدیث

ششماہی علمی مجله جدید قرآنی افکار، جولائی تا دسمبر ۲۰۲۵، سال ۱، شماره ۲
New Horizons in Quranic Studies, July - December 2025/ Vol.1, No. 2
An Exploring the Aesthetics of Ḥayāt Ṭayyibah (the Pure Life) in the Light of the Qurʾān: An Analytical Study of Its Influence on Human Lifestyle
Ali Karimpoor Qaramalaki & Syed Muhammad Ali Raza

An Exploring the Aesthetics of Ḥayāt Ṭayyibah (the Pure Life) in the Light of the Qurʾān: An Analytical Study of Its Influence on Human Lifestyle

Ali Karimpoor Qaramalaki [1] and **Syed Muhammad Ali Raza** [2]

1. Assistant Professor and Head of the Qur’anic Sciences Department, Higher Educational Center for Quran and Hadith, Al-Mustafa International University. Email: karimpoorali@yahoo.com
2. Bachelor’s in Qur’an and Hadith, Higher Educational Center for Qur’an and Hadit, Al-Mustafa International University. Email: syedaliraza125110@gmail.com

Article Info

Article type:
Research Article

Article history:
Received:
1 August 2025
Received in revised:
8 October 2025
Accepted:
24 November 2025
Available online:
2 December 2025

Keywords:
Ḥayāt Ṭayyibah;
Theoretical Benefits of Ḥayāt Ṭayyibah;
Affective (Emotional) Benefits of Ḥayāt Ṭayyibah;
Practical Benefits of Ḥayāt Ṭayyibah.

ABSTRACT

The nature of life termed “Ḥayāt Ṭayyibah” was first presented by the Noble Messenger (PBUH) in Sūrah An-Naḥl, verse 97. In this blessed verse all human beings are invited to be drawn toward this particular mode of life. Undoubtedly, ascribing the term life to Ḥayāt Ṭayyibah yields, on theoretical, affective, and practical levels, aesthetic and salutary manifestations whose explication and analysis can produce positive effects on adherence to religious teachings. With this objective in view, the present paper attempts to assess the beneficial effects of Ḥayāt Ṭayyibah across those dimensions. The findings of the study — obtained by a descriptive-analytical method and based upon library sources and the exegesis of Qur’anic verses — indicate that: theoretically, Ḥayāt Ṭayyibah plays an effective role in awakening human awareness of the unseen (ʿālam al-ghayb), in recognizing human states and qualities, and in broadening the mental horizon; affectively, it fosters the consolidation of love and compassion, sustains devotion to God and affection for God’s creation, and gives rise to enduring and universal paradigms; and practically, it plays an unparalleled role in ensuring respect for human rights, supporting the oppressed against the oppressor, establishing public justice and equity, and in engendering spirituality within human life.

Cite this article: Qaramalaki & Ali Raza. (2026). An Exploring the Aesthetics of Ḥayāt Ṭayyibah (the Pure Life) in the Light of the Qurʾān: An Analytical Study of Its Influence on Human Lifestyle

New Horizons in Quranic Studies, 1 (2), 188-215

© The Author(s).

Publisher: Al-Mustafa International University

ششماہی علمی مجلہ جدید قرآنی افکار، جولائی تا دسمبر ۲۰۲۵، سال ۱، شمارہ ۲
New Horizons in Quranic Studies, July - December 2025/ Vol.1, No. 2

قرآنی کی روشنی میں پاکیزہ زندگی (حیات طیبہ) کی جمالیات کا تجزیہ اور طرز زندگی پر اس کے اثرات*

علی کریم پور قراملکی[1] اور سید محمد علی رضا[2]

اشاریہ

حیاتِ طیبہ " جیسی زندگی کی نوعیت کو سب سے پہلے رسولِ گرامی اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورۂ نحل کی آیت نمبر ۹۷ میں پیش فرمایا۔ اس آیتِ مبارکہ میں تمام انسانوں کو اس مخصوص طرزِ حیات کی طرف راغب ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔ یقینی طور پر، "حیات" کو "حیاتِ طیبہ" سے متصف کرنے سے نظری، جذباتی اور عملی پہلوؤں میں ایسے حسین جلوے ظاہر ہوتے ہیں جن کی تشریح و تحلیل سے انسانوں کے دینی تعلیمات پر عمل میں مثبت اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ اسی مقصد کے تحت اس تحریر میں کوشش کی گئی ہے کہ حیاتِ طیبہ کے مثبت اثرات کو مذکورہ پہلوؤں میں پرکھا جائے۔ تحقیق کے نتائج، جو کہ توصیفی و تجزیاتی طریقہ کار کے ساتھ اور کتب خانہ جاتی مآخذ و قرآنی آیات کے مفاہیم سے استفادہ کرتے ہوئے حاصل کیے گئے ہیں، اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ: حیاتِ طیبہ نظری اعتبار سے انسان کے عالمِ غیب سے آگاہی، انسانی احوال و صفات کی پہچان، اور ذہنی افق کے پھیلاؤ میں مؤثر کردار ادا کرتی ہے؛ جذباتی پہلو سے، یہ محبت و شفقت کے استحکام، خدا اور مخلوقِ خدا سے عشق کی پائیداری، اور دائمی و آفاقی نمونوں کی تشکیل کا باعث بنتی ہے؛ جبکہ عملی میدان میں، یہ انسانوں کے حقوق کی رعایت، ظالم کے مقابلے میں مظلوم کی حمایت، عوامی عدل و انصاف کے قیام، اور انسانی زندگی میں روحانیت پیدا کرنے میں بے نظیر کردار ادا کرتی ہے۔

کلیدی الفاظ : حیاتِ طیبہ، نظری حسناتِ حیاتِ طیبہ، جذباتی حسناتِ حیاتِ طیبہ، عملی حسناتِ حیاتِ طیبہ۔

---

* موصول ہونے کی تاریخ: ۲۰۲۵/۱۰/۸ & آرٹیکل کی تایید کی تاریخ: ۲۰۲۵/۱۱/۲۴

[1] اسسٹنٹ پروفیسر اور سربراہ شعبہ علوم قرآن، قرآن و حدیث ہائر ایجوکیشن سینٹر، المصطفی انٹرنیشنل یونیورسٹی.
(karimpoorali@yahoo.com)

[2] بی ایس (قرآن و حدیث)، قرآن و حدیث ہائر ایجوکیشن سینٹر، المصطفی انٹرنیشنل یونیورسٹی.
(syedaliraza125110@gmail.com).

تمہید

نفسیات کے علم کی رو سے یہ بات ثابت شدہ ہے کہ جب لوگ کسی تصور یا موضوع کے مثبت اثرات اور کارکردگیوں سے واقف ہو جاتے ہیں تو وہ خود بخود اس کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ اسلام کی پہچان اور انسانوں کو اس دینِ فطرت کی طرف راغب کرنے کا سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے کہ معاشرے کے تمام افراد کے سامنے اس شجرۂ طیبہ (اسلام) کی فکری، روحانی اور عملی خوبصورتیوں اور برکتوں کو پیش کیا جائے۔ حیاتِ طیبہ بھی اسلام کی اسی درخشاں شاخ اور خوبصورت تصویر کی مانند ہے، جو تبھی لوگوں کو ایمان و دین کی طرف کھینچ سکتی ہے جب انسان اس کے مثبت اثرات سے واقف ہوں۔ اسی لیے اس بحث میں کوشش کی گئی ہے کہ حیاتِ طیبہ کے اہم اور قابلِ توجہ اثرات کو مختلف زاویوں سے تفصیل کے ساتھ زیرِ غور لایا جائے۔

موضوع کا پس منظر

قرآنی محققین کی تصانیف کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ "حیاتِ طیبہ" کے موضوع پر عمومی اور کلی انداز میں مختلف مقالات تحریر کیے گئے ہیں، مثلاً:

- مقالہ: «مفہوم شناسی نظام قرآن‌بنیان تأمین اجتماعی با تاکید بر مفہوم حیات طیبہ» مہدی عبداللہی و دیگران، مجلّہ آموزہ‌ہای قرآنی، سال ۱۴۰۰ھ۔ش، شمارہ ۳۴، صفحات ۵۳ - ۸۰۔
- مقالہ: «ماہیت و مؤلفہ‌ہای حیات طیبہ و ظرف تحقق آن در سبک زندگی اسلامی» زہرہ سادات نبوی، مجلّہ پژوہش‌ہای تمدن نوین اسلامی، زمستان ۱۴۰۰ھ۔ش، شمارہ ۲، سال اول، صفحات ۲۹۳ - ۳۱۶۔
- مقالہ: «تحلیل و بررسی مقایسہ‌ای حیات طیبہ از منظر مرحوم علامہ طباطبایي و مرحوم استاد مصباح یزدی» زینب درویشی و دیگران، مجلّہ پژوہش‌ہای مابعدالطبیعی، سال ۱۴۰۲ھ۔ش، شمارہ ۱۱، صفحات ۲۸۷ - ۳۱۶، و...۔

یہ تمام تحریریں حیاتِ طیبہ کے بارے میں لکھی گئی ہیں، لیکن قرآن کے نقطۂ نظر سے "حیاتِ طیبہ" کے مختلف پہلوؤں اور اس کے جمالیاتی (خوبصورتی کے) زاویوں کو جامع انداز میں بیان کرنے والی کوئی مستقل تصنیف یا تحقیقی اثر نگارندہ کے مطالعے میں نہیں آیا۔

مفہوم شناسی (مفہوم کی وضاحت)

لفظ "حیات"، مادہ "حیّ" سے ہے، جس کے معنی زندہ ہونا اور زندگی کے ہیں۔ (فیومی، ۱۳۹۷ش: ص۱۶۰) لفظ "طیّبہ" کے معنی پاکیزہ اور خوشگوار بیان کیے گئے ہیں۔ (فراہیدی، ۱۴۲۰ق: ج۷، ص۴۶۱؛ ابن منظور، ۱۴۰۸ق: ج۱، ص۵۶۳) ترکیب "حیاتِ طیبہ" (بطور ترکیب اضافی یا وصفی) کے معنی مفید، خوشگوار، اور کم و بیش عیب و نقص سے پاک زندگی کے ہیں۔ (قرشی، ۱۳۷۸ش: ج۵، ص۲۵۸) اصطلاحاً "حیاتِ طیبہ" اس طرزِ زندگی کو کہا جاتا ہے جس میں انسان حسی اور خیالی زندگی سے گزر کر حقیقی اور اصیل زندگی میں قدم رکھتا ہے۔ (مطہری، ۱۳۶۸: ج۲۵، ص۴۴۹) لغوی ماہرین کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ "حیات"، "ممات" کے مقابل میں زندہ ہونے اور زندگی کے معنی میں ہے، جبکہ "طیّبہ"، "خبیثہ" کے مقابل میں پسندیدہ، لذت بخش اور نیک کے معنی میں آتا ہے۔ لہٰذا "حیاتِ طیبہ" کا مفہوم پاکیزہ، نیک، حلال اور پسندیدہ زندگی ہے۔

حیاتِ طیبہ کے جمالیاتی پہلو

چونکہ حیاتِ طیبہ کا وصف "طیّبہ" ہے، اس لیے یہ زندگی اپنی نوعیت میں برکتوں، پاکیزگیوں، اور مثبت اثرات سے بھرپور ہے۔ اس کے اثرات عقیدتی (ایمانی)، عاطفی (جذباتی) اور رفتاری (عملی) میدانوں میں نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ قرآنِ کریم کی آیات سے استناد کرتے ہوئے، ان میں سے چند پہلوؤں کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن کا ذکر آگے کیا جائے گا۔

الف۔ حیاتِ طیبہ کی نظری خوبیاں

۱۔ غیب کے جہان سے آگاہی

وہ جہان جس میں تمام انسان زندگی گزارتے ہیں اور جو سب کے لیے بیک وقت قابلِ مشاہدہ ہے، وہ یہی محسوس اور مادی دنیا ہے۔ لیکن اسی دنیا کے باطن میں ایک اور جہان بھی موجود ہے جسے عالمِ غیب کہا جاتا ہے، اور صرف وہی لوگ جو حیاتِ طیبہ میں داخل ہوتے ہیں، ان جہانوں سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ کیونکہ جب تک انسان قرآن کی تعلیمات سے واقف نہ ہو، وہ خدا کی مطلق تجرد (یعنی غیر مادی اور خالص ہستی) سے بھی ناآشنا رہتا ہے۔ اس کی مثال یہود و نصاریٰ کے پیروکار ہیں، جو سورۂ توبہ کی آیت ۳۰ کے مطابق، حضرت عزیرؑ اور حضرت عیسیٰؑ کو الوہیت میں شریک مان کر، خدا کی وحدانیت اور تجرد سے منحرف ہوگئے۔ جبکہ قرآنِ

کریم اپنے تمام پیروکاروں کو اس حقیقت سے روشناس کراتا ہے کہ خداوندِ متعال تجردِ محض ہے۔ (طباطبائی، ۱۴۱۷ق: ج۹، ص۲۴۳)

عالمِ غیب سے مراد وہ جہان ہے جو محسوسات سے ماورا اور مجردات پر مشتمل ہے، اور اس کی کامل ترین مثال خود ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ اسی طرح عالمِ وحی بھی عالمِ غیب میں شامل ہے، جیسے عالمِ ملائکہ، جنّات، ارواح اور عقول بھی دیگر غیبی جہانوں میں سے ہیں۔ یہ بات کہ کائنات میں مجرد اور غیبی حقائق موجود ہیں، اس کی گواہی سورۂ اخلاص کی پہلی آیت دیتی ہے:

«قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ» (الاخلاص: ۱) ترجمہ: "کہہ دو: وہ اللہ ایک ہے۔"

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کسی پہلو سے بھی مرکب نہیں، نہ خارجی طور پر اور نہ عقلی طور پر، بلکہ وہ ہر اعتبار سے بسیط (سادہ و غیر مرکب) اور محض مجرد ہے۔ (طبرسی، ۱۳۷۲ق: ج۱۰، ص۸۵۹)

اسی طرح سورۂ شوریٰ کی آیت ۱۱ میں فرمایا گیا: فَاطِرُ السَّمَاوَاتِ وَ الْأَرْضِ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجاً ... لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ (الشوریٰ: ۱۱)

ترجمہ: "وہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس نے تم میں سے تمہارے لیے جوڑے بنائے... کوئی چیز اس کی مانند نہیں، اور وہ خوب سننے والا، خوب دیکھنے والا ہے۔"

یہ آیت اس بات کی خبر دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ بے مثال ہے اور بے مثالی کا مطلب یہ ہے کہ وہ وجودِ محض ہے، جو کہ مجرد وجود کے برابر ہے۔ (صادقی تہرانی، ۱۳۶۵ق: ج۲۶، ص۱۳۱)

ان تمام باتوں کے علاوہ، وہ ذہن جو حیاتِ طیبہ میں داخل ہو چکا ہوتا ہے، قیامت کے دن کی صفات و حالات سے بھی آگاہی حاصل کرلیتا ہے۔ کیونکہ انسان جب قرآنِ کریم کی تلاوت کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ معاد (دوبارہ زندہ ہونا) وہ دن ہے جس میں یقیناً تمام انسان جمع کیے جائیں گے۔ نیک لوگ اپنی نیکیوں کا اجر پائیں گے اور بدکار اپنے اعمال کی سزا بھگتیں گے۔ اہلِ جنت کے لیے طرح طرح کی نعمتیں تیار ہیں، جیسے اہلِ دوزخ کے لیے مختلف قسم کے عذاب مہیا ہیں۔ جو لوگ قاصر (نہ سمجھنے والے) ہوں گے، وہ عفوِ الٰہی کے تحت جنت میں داخل ہوں گے، جبکہ مقصرین (جان بوجھ کر گناہ کرنے والے) ناقابلِ بخشش گناہوں کی وجہ سے عذابِ الٰہی میں مبتلا ہوں گے۔ مشرکین اور ملحدین ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہیں گے، جبکہ گناہگار مؤمنین اپنے

گناہوں کی مقدار کے مطابق جہنم کا عذاب بھگتنے کے بعد وہاں سے نکال کر جنت میں داخل کیے جائیں گے۔ اس دن انسان دو گروہوں کی صورت میں نظر آئیں گے ـــ کچھ خوش و خرم اور کچھ غمگیں۔ ہر شخص اپنی نامۂ اعمال اور اپنے انجام کے بارے میں فکر مند ہوگا۔ اس دن کی سختیاں اتنی زیادہ ہوں گی کہ ہر انسان صرف اپنی ہی فکر میں ہوگا، یہاں تک کہ تمام لوگ اپنے رشتہ داروں اور عزیزوں سے بھی بھاگ جائیں گے۔

۲ .انسان کی حالتوں اور صفات کی پہچان

قرآن کی تعلیمات کے مطابق انسان کی پہچان نہایت گہری، عقلی اور حقیقی ہے۔ اسلام کا تصورِ انسان تورات اور انجیل کی مانند نہیں ہے، جن کے مطابق حضرت آدمؑ کے شجرۂ ممنوعہ کھانے سے تمام نسلِ آدم ناپاک ہوگئی اور اس گناہ کی تلافی کے لیے خدا کو حضرت عیسیٰؑ کو قربان کرنا پڑا۔ اسی طرح، اسلام یہودیوں کی طرح نسلی برتری کا بھی قائل نہیں کہ اس کے ذریعے بے گناہ انسانوں پر ظلم کو جائز قرار دیا جائے۔ اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت آدمؑ بنی آدم کے لیے ایک نمونۂ کامل اور مجسم علامت ہیں تاکہ انسان ہوشیار اور بیدار رہے، اور یہ سمجھے کہ ہر لمحہ وہ اندرونی اور بیرونی وسوسوں کے حملے کی زد میں ہے۔ اگر وہ ان حملوں کے نقطۂ آغاز اور مقصد کو نہ سمجھے تو وہ بھی حضرت آدمؑ کی طرح اپنے گناہ کے تکوینی نتائج بھگت سکتا ہے، اور الٰہی امن کے مقام سے نکالا جا سکتا ہے۔ اسی طرح، انسان زمین پر خداوند کا مظہر اور خلیفہ ہے۔ انسان کی زندگی کا مقام اگرچہ خدا کے تکوینی حکم سے زمین پر مقرر ہوا ہے، مگر اس کی حرمت اور قدر و منزلت تمام مخلوقات سے بلند ہے۔ اسی لیے انسان کو خدا کا نائب شمار کیا گیا ہے۔ خداوند نے اپنی روح کا نفخہ اس میں پھونک کر اسے جاودانی عطا کی، البتہ اس کے انجام اور مقدر کا تعین خود انسان کے اختیار میں رکھا گیا ہے۔ اگر انسان اپنی فطرت میں ودیعت کردہ الٰہی سرمایہ کی پیروی کرے اور خدا کی طرف حرکت کرے، تو وہ ہمیشہ خوشی اور کامیابی کی زندگی گزارے گا، لیکن اگر وہ شیطانی اور حیوانی پہلوؤں کے پیچھے چلے، تو پشیمانی اور گمراہی میں مبتلا رہے گا۔ اسی بنا پر، انسان کی وجودی قدر و قیمت بہت بلند ہے اور اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ وہ اپنی حقیقی حیثیت کو پہچانے۔

مزید یہ کہ، چونکہ انسان روح رکھتا ہے، اس لیے اس کی فنا یا نابودی ممکن نہیں۔ وہ اس دنیا میں پیدا ہونے کے ساتھ ایک جسمِ مادی کا لباس پہنتا ہے، اور کچھ عرصے بعد موت کے ذریعے ـــ جو نیند کی مانند ہے ـــ عالمِ برزخ میں قدم رکھتا ہے۔ وہاں وہ بدنِ برزخی کے ساتھ رہتا ہے، یہاں تک کہ قیامت کا دن آ

جائے۔ پھر جب وہ ابدی جہان میں منتقل ہوگا، تو آخرت کا بدن اختیار کرے گا، تاکہ ہمیشہ کے لیے اپنی ابدی زندگی کو سعادت یا حسرت کے ساتھ شروع کرے۔

اسی طرح، انسان اپنی عقل کے سہارے اکیلا اپنے مقصدِ حیات کو درست طور پر پہچان نہیں سکتا، اور نہ ہی وہ اس قابل ہے کہ خود سے صحیح طرزِ زندگی اختیار کر کے اپنے اصلی مقصد تک پہنچ سکے۔ ان دونوں صورتوں میں وہ الٰہی رہنمائی کا محتاج ہے۔ چونکہ انسان کے اندر اور باہر کے خطرات بہت سخت اور تباہ کن ہیں، لہٰذا ان پر قابو پانے کے لیے طاقتور مدد درکار ہے۔ یہ قوت فرشتوں، انبیائے الٰہی، ائمہ معصومینؑ اور اولیائے خدا کی صورت میں ہے، جو اپنی روحانی قوت کے ذریعے انسان کو اپنی روحانی کشش کے دائرے میں لے کر گمراہی سے نجات دے سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے، اکیلا انسان اُس انگارے کی مانند ہے جو جلد بجھ جاتا ہے اور اس کی حرارت کمزور ہوتی ہے، لیکن جب وہ دیگر انسانوں (اہلِ ایمان و رہنماؤں) کے ساتھ جڑ جاتا ہے تو اس کی طاقت میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ دیر تک روشن رہتا ہے۔

۳. انسان کے ذہنی پہلوؤں کی وسعت

فطری طور پر، جب کوئی انسان حیاتِ طیبہ کے دائرے میں داخل ہوتا ہے، تو وہ عالمِ ہستی کے باطنی اور ملکوتی پہلو سے بھی آگاہی حاصل کر لیتا ہے۔ وہ یہ علم پا لیتا ہے کہ یہ موجودہ کائنات، جو بظاہر مختلف اشیاء اور مخلوقات کے باہمی تعلقات سے بنی ہوئی ہے، دراصل خداوندِ عالم سے بھی براہِ راست وابستہ ہے۔ یہ وابستگی دراصل وجود کے اس پہلو سے ہے جو ہر زندہ شے میں پایا جاتا ہے۔ کوئی بھی مخلوق اپنے آپ کو اس نسبت سے الگ نہیں کر سکتی، کیونکہ کسی بھی مخلوق کا وجود اس کا ذاتی نہیں ہے۔ اسی لیے ہر مخلوق اپنی موجودگی کے لیے خدا کی عنایات اور فیضِ وجود کی محتاج ہے۔ خداوندِ متعال نے سورۂ فاطر، آیت ۱۵ میں فرمایا ہے: «يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ» (فاطر: ۱۵) ترجمہ: "اے لوگو! تم سب کے سب خدا کے محتاج ہو، اور خدا ہی ہے جو بے نیاز اور لائقِ حمد و ستائش ہے۔"

اس آیت کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت پر زور دیا کہ صرف وہی غنی اور حمید ہے، اور تمام مخلوقات اپنی ہستی اور آثارِ ہستی میں اسی کے محتاج ہیں۔ (فخر رازی، ج ۲۶، ص ۲۲۹) چنانچہ تمام مخلوقات نے اللہ سے ہی وجود کا لباس پہنا ہے اور بالآخر اسی کی طرف لوٹنے والی ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ، آیت ۱۵۶ میں فرمایا:

«الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ» (البقرہ: ۱۵۶) ترجمہ: ”وہ لوگ کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں: ہم اللہ کے ہیں اور ہم کو اسی کی طرف لوٹنا ہے۔“ ان کے ساتھ ساتھ، قرآنِ کریم انسان کے ذہن کو دائرۂ وجود سے آگے بڑھا کر قدرت کے مظاہر میں پائے جانے والے قوانین کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے، کیونکہ قرآنِ مجید میں بہت سی علمی آیات موجود ہیں جو اس شخص کو، جو حیاتِ طیبہ میں داخل ہوتا ہے، ان سائنسی و طبیعی حقائق سے روشناس کرتی ہیں۔ قرآن کی وہ علمی نشانیوں پر مبنی آیات جن میں ایسے سائنسی حقائق بیان کیے گئے ہیں جو آیت کے نزول کے وقت کسی کے علم میں نہیں تھے بلکہ صدیوں بعد سائنسدانوں نے ان کو دریافت کیا، اسی زمرے میں آتی ہیں۔ (رضائی اصفہانی، ص ۸۵)

اسی طرح وہ آیات جو آسمان، زمین، انسان، حیوانات اور قدرتی مظاہر کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور انسان کو ان میں غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں— بعض اوقات انہیں خدا اور آخرت کی نشانیوں کے طور پر بھی پیش کرتی ہیں۔ یہ آیات اگرچہ ظاہری طور پر کوئی حیران کن یا معجزہ نما مضمون پیش نہیں کرتیں، مگر وہ انسان کو کائنات کی خوبصورت تخلیقات پر غور کرنے کی دعوت دیتی ہیں اور اس طرح علمی و سائنسی ترقی کی بنیاد فراہم کرتی ہیں، خصوصاً تجربی علوم (Natural Sciences) کے میدان میں۔ مثلاً، سورۂ غاشیہ، آیت ۱۷ میں فرمایا:

«أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ» (الغاشیہ: ۱۷) ترجمہ: ”کیا وہ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کیسے پیدا کیا گیا؟“

اسی طرح سورۂ نحل کی آیات ۵، ۶، ۷، ۱۰، ۱۱، ۱۳، ۱۴ میں جانوروں کے فوائد، بارش کے نزول، رنگ برنگے پودوں کی روئیدگی، سمندروں، کشتی رانی اور ان سے حاصل ہونے والی غذائیں اور زیورات کو عقل مندوں کے لیے نشانیوں کے طور پر بیان کیا گیا ہے، تاکہ وہ خالقِ کائنات کو پہچان کر شکر گزار بنیں۔ واضح ہے کہ یہ تمام آیات قرآن پڑھنے والے کے ذہن کو کائنات کے نظامِ قوانین سے آگاہ کرتی ہیں اور اسے اس بات کی ترغیب دیتی ہیں کہ وہ انسانی علوم اور تجربی علوم دونوں میں مزید تحقیق و جستجو کرے۔ (کریم پور قراملکی، ۱۴۰۱ش: ص ۶۷)

ب۔ حیاتِ طیبہ کی جذباتی (عاطفی) خوبیاں

حیاتِ طیبہ، دیگر انسانی طرزِ حیات کی طرح، اپنے جذباتی آثار رکھتی ہے۔ وہ انسان جو حیاتِ غربی میں رہتا ہے اور وہ انسان جو حیاتِ شرقی کے ماحول میں پلتا ہے، اُن کے جذبات اور عواطف مختلف ہوتے ہیں۔ اس کا

ثبوت وہ رویّے ہیں جو ان دونوں افراد میں مختلف ماحولوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں مراد محض جغرافیائی مغرب نہیں بلکہ وہ مغربی ثقافت ہے جو مفادپرست اور حیوانی سوچ سے جنم لیتی ہے، اور اس کے مقابلے میں شرقی حیات وہ ہے جو عرفانیت اور انسانی اخلاقیات سے متاثر ہوتی ہے۔ متعدد آثار میں یہ فرق واضح کیا جا سکتا ہے۔

۱. محبت وصفا کا عالمی ہونا

وہ انسان جو قرآنِ مجید کی روشنی میں زندگی گزارتا ہے، اس کی روح نازک اور لطیف بن جاتی ہے؛ کیونکہ الٰہی فرمانبرداری کی روح اس کے باطن کو ملائم کرتی ہے اور اسے تواضع و انکساریِ روح عطا کرتی ہے۔ یہ انسان نہ صرف اپنے ہم نوع کی حرمت کا خیال رکھتا ہے بلکہ دیگر مخلوقات کی قدر و قیمت —— چاہے وہ زندہ ہوں یا غیر زندہ —— کا بھی پاس کرتا ہے۔ اس طرح یہ انسان اپنی الٰہی اور انسانی روحانیت کے اثر سے اپنے ہم نوع کے تئیں مہربان ہو جاتا ہے۔ تاہم، "ہم نوع" کی تعریف مقاصد اور خواہشات کے مطابق بہت مختلف ہو سکتی ہے۔ جو شخص قرآنی تعلیمات کے سائے میں پلتا ہے، وہ انسان کو ایک انسانی تخلیق کے تناظر میں دیکھتا ہے؛ جبکہ غیر قرآنی نظر انسان کو حیوانی فطرت کے دائرے میں دیکھتی ہے۔ دونوں ہی نظریے ہیں، مگر زاویۂ نگاہ ایک انسانی ہے اور دوسرا حیوانی۔ قرآنی نقطۂ نظر کے مطابق، ہر انسان کی حیات خداوند سے ماخوذ ہے؛ لہٰذا کسی بھی انسان کو دوسرے انسان کی حیات کا حق پامال کرنے کا حق نہیں ہے، چاہے وہ اس کے نظریات سے متفق نہ بھی ہو۔ مگر غیر قرآنی عقل عام طور پر فائدے اور نقصان کے پیرائے میں سوچتی ہے —— جہاں مادّی منافع موجود ہوں، وہاں دوسرے انسان کو ختم کرنا، اس کا استحصال یا استعمال کرنا جائز سمجھ لیا جاتا ہے۔

۲. خدا سے محبت اور خلقِ خدا کی خدمت کرنا

بدن کو فرسودگی (بڑھاپے) سے محفوظ رکھنا کسی حد تک انسان کے اختیار سے باہر ہے، لیکن روح انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔ انسان اگر روحانی غذا حاصل کرے تو وہ اپنی روح کو ہمیشہ زندہ، بیدار اور تروتازہ رکھ سکتا ہے، چاہے جسمانی عمر بڑھ جائے۔ اسی لیے جیسے جیسے جسمانی عمر بڑھتی ہے، اللہ کے عارفین کی روحیں اور زیادہ زندہ، جوان اور شاداب ہوتی جاتی ہیں، کیونکہ روح جب خداوند، عوالمِ غیب اور اولیائے الٰہی کی ارواح سے متصل ہوتی ہے تو وہ زیادہ منور، پاکیزہ اور خالص بن جاتی ہے۔ ایسی روح کو، جب وہ راہِ الٰہی پر گامزن ہوتی ہے، کبھی تھکن محسوس نہیں ہوتی۔ وہ قربِ الٰہی کے حصول کے لیے آرام دہ بستر کو چھوڑ دیتی ہے اور دشت و بیابان

کی سختیوں کو دنیاوی راحتوں پر ترجیح دیتی ہے۔ ایسی روح کو زندگی میں نہ افسردگی کا احساس ہوتا ہے نہ بے دلی کا، کیونکہ وہ خدا کی راہ میں متحرک ہے، اور حرکت میں رہنے والا کبھی جامد نہیں ہوتا۔ اس کے لیے مستقبل روشن ہوتا ہے، کیونکہ اس کا ہدف کمالِ مطلق اور دائمی، میٹھا و پاکیزہ حیات ہے۔ ایسا شخص سعادت کو دل سے محسوس کرتا ہے اور ایمان و یقین کے ساتھ اپنے مقصد کو پالیتا ہے۔ وہ علمِ حصولی (سن کر یا پڑھ کر حاصل کردہ علم) سے آگے بڑھ کر علمِ حضوری و مشاہداتی (دلی و تجرباتی علم) کی منزل پر پہنچ چکا ہوتا ہے۔ یقیناً، بھلائی کے راستے میں نہ تھکنا، احساسِ ذمہ داری کا نتیجہ ہے۔ جب کوئی شخص کسی کام کو محض فرض و ذمہ داری کے احساس سے انجام دیتا ہے تو جب تک وہ اپنے فرض کو پورا نہ کرلے، تھکتا نہیں، کیونکہ وہ کام کو ادھورا چھوڑ نہیں سکتا۔ اسی وجہ سے دین کے احیا کرنے والے اور لوگوں کو ہدایت دینے والے مبلغین کبھی تھکن محسوس نہیں کرتے، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ لوگوں کو حق پہنچانا ان کی خدائی ذمہ داری ہے۔ ایسے لوگ اپنے اندر عزم و استقامت کا جذبہ محسوس کرتے ہیں۔ وہ اپنی توانائی اپنے باطن سے حاصل کرتے ہیں اور خدا کے سوا کسی اور سے طاقت نہیں لیتے۔ یہاں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایسے افراد کی روح ہمیشہ روحِ الٰہی سے وابستہ رہتی ہے، کیونکہ خدا سے تعلق منقطع ہو جانا انسان کو راہِ مقصد میں آدھے راستے پر چھوڑ دیتا ہے اور اسے ہدف تک پہنچنے سے روک دیتا ہے۔ لہٰذا، ہر انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ احساسِ ذمہ داری، روحانی بالیدگی، زندگی کی تازگی اور استقامت کے حصول کے لیے "حیاتِ طیبہ" میں داخل ہو۔ اس پاکیزہ زندگی میں جب انسان قرآنی و دینی مثبت لہروں کے زیرِ اثر آتا ہے، تو اس کی روح میں یہ اعلیٰ احساس خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔

۲. عالمی اور جاودانی نمونہ

حیاتِ طیبہ وہ واحد طرزِ زندگی ہے جو پوری انسانیت کے لیے ایک ایسا نمونہ پیش کر سکتی ہے جو عالمی سطح پر قابلِ اقتدا ہو اور ہمیشہ باقی رہے۔ اس طرزِ حیات میں ایسے عظیم انسانوں کی مثالیں موجود ہیں جیسے: رسولِ گرامی اسلام ﷺ، امامُ المتقین حضرت علیؑ، اور امام حسینؑ جیسے پیشوا، جو انسانیت کے سامنے اسلامی طرزِ زندگی کے نمونے کے طور پر پیش کیے گئے۔ مثلاً، رسولِ اسلام ﷺ وہ ہستی ہیں جو حیاتِ طیبہ کے زیرِ سایہ پروان چڑھے اور اعلیٰ ترین اخلاقی مقام "خُلُقِ عظیم" تک پہنچے۔ (ملاحظہ ہو: کریم پور قراملکی، علی، مقالہ: «جستاری در معناشناسی و گسترہ خلق عظیم در قرآن کریم»، جلد ۶، شمارہ ۱۲، مہر ۱۳۹۸ش، ص ۲۵۳-۲۷۴)

لفظ "خُلق" لغت میں، لام کی سکون یا ضم کے ساتھ، انسان کی اندرونی صورت یا طبیعت کے معنی میں آتا ہے، جسے "سیرت" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ صفت اچھی بھی ہو سکتی ہے، جیسے جوانمردی اور شجاعت، اور بری بھی ہو سکتی ہے، جیسے پست ہمتی اور بزدلی۔ البتہ جب لفظ خُلق یا اخلاق بغیر کسی قید یا وصف کے استعمال کیا جائے، تو اس سے مراد پسندیدہ خُلق لیا جاتا ہے۔ (طباطبائی، ۱۴۱۷ق: ج۱۹، ص۳۶۶) اصطلاحاً، خُلق ایک ایسی پختہ کیفیت یا حالتِ نفس ہے جس کی وجہ سے انسان کے افعال بغیر سوچے سمجھے ظاہر ہوتے ہیں۔ ملکہ وہ نفسی کیفیت ہے جو دیر سے ختم ہوتی ہے، جبکہ حال وہ کیفیت ہے جو جلد زائل ہو جاتی ہے۔ خُلق انسان میں دو طریقوں سے پیدا ہوتا ہے: ۱) مزاج اور عادت کے ذریعے، یعنی کسی کام کو بار بار کرنے سے؛ ۲) یا تکلیف، صبر اور پائداری کے ساتھ کسی نیک عمل پر قائم رہنے سے۔ مثال کے طور پر، سخاوت کا خُلق اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان عطا کرتے وقت تردد محسوس نہ کرے، بلکہ فطری طور پر بخشش کرے۔ اس طرح، سخاوت اس کی طبیعت کا حصہ بن جاتی ہے۔ علمائے اخلاق کے نزدیک، خُلق یا اخلاق کے تین معنی بیان کیے گئے ہیں: پختہ نفسی صفات، نفسانی خصوصیات، اور اخلاقی فضائل۔ (مصباح یزدی، ۱۳۹۴ش، ص۱۹)

شیخ طوسیؒ کے نزدیک (ج۱۰، ص۷۶)، خُلق کا مطلب ہے کسی فعل کو عادت کے مطابق مسلسل انجام دینا۔ خُلقِ کریم سے مراد ہے: حق پر صبر، سخاوت اور کشادہ دلی، اور عقل و دانائی کے مطابق امور کی تدبیر۔ شیخ طوسیؒ کے مطابق، خُلقِ کریم تین عناصر پر مشتمل ہے: مزاحمت (استقامت)، بخشش (سخاوت)، اور عقل مندانہ تدبیر۔ جب یہ تینوں عناصر ایک ساتھ جمع ہوں، تو خُلق کریم وجود میں آتا ہے۔ مرحوم طوسیؒ کے بیانات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک خُلقِ عظیم فردی اور اجتماعی دونوں طرح کے اخلاق پر مشتمل ہے۔ مرحوم طبرسیؒ کے نظریے کے مطابق (طبرسی، ۱۳۷۲ش: ج۱۰، ص۵۰۰) "خُلقِ عظیم" سے مراد رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاقِ فردی و اجتماعی ہیں، جن میں سماجی اخلاق پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرحوم طبرسیؒ نے "خُلقِ عظیم" کے بارے میں چھ مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد کسی کو رد نہیں کیا، بلکہ خود بھی خوش اخلاقی اور حسنِ خُلق سے متعلق ایک حدیث ذکر فرمائی۔ یہ تمام قرائن اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اُن کے نزدیک "خُلقِ عظیم" سے مراد بالخصوص اخلاقِ اجتماعی ہیں۔ زمخشریؒ کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کو "عظیم" کہنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی قوم کی طرف سے پہنچنے والی اذیتوں کو

بڑے صبر و تحمل سے برداشت کیا اور ان کی مخالفت کا بہترین طریقے سے سامنا کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بردباری سے ان پر غالب آئے۔ (زمخشری، ۱۴۰۷ق: ج۴، ص۵۸۵)

علماء جیسے فیض کاشانیؒ (علماءِ قرنِ یازدہم) اور محمد قمی مشہدیؒ (علماءِ قرنِ دوازدہم) کا بھی یہی کہنا ہے کہ "خُلقِ عظیم" سے مراد وہ حسنِ خُلق اور وہ ادب ہے جس کے ذریعے خداوندِ متعال نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دوسروں سے ممتاز فرمایا۔ (فیض کاشانی، ۱۴۱۵ق: ج۵، ص۲۰۸؛ قمی مشہدی، ۱۳۶۸ش: ج۱۳، ص۳۷۴) عصرِ حاضر میں بھی "خُلقِ عظیم" کی تفسیر مختلف پہلوؤں سے کی گئی ہے، مثلاً: عمومی اخلاق، اخلاقِ اجتماعی، آدابِ قرآنی، اور مصیبتوں پر صبر کا ادب۔ مثال کے طور پر مرحوم علامہ طباطبائیؒ (طباطبائی، ۱۴۱۷ق: ج۱۹، ص۳۶۹) کے نزدیک یہ آیت مبارکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاقِ فردی کی فضیلت کے بیان کے بجائے زیادہ تر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاقِ اجتماعی کی برتری کو ظاہر کرتی ہے۔ استاد جوادی آملیؒ کے نزدیک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خُلق، قرآن اور اخلاقِ الٰہی کی طرح ہے، یا یہ ایک باطنی حقیقت اور نفسانی ملکہ ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ وجود میں آئی۔ یہی ملکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام نیک اعمال، خواہ وہ فردی ہوں یا اجتماعی، کی بنیاد ہے۔ اسی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کو "عظیم" کہا گیا ہے۔ (جوادی آملی، پایگاہ اسراء، جلسہ ۲) بعض معاصر مفسرین کے نزدیک بھی "خُلقِ عظیم" سے مراد مطلق اخلاق و ادبِ آسمانی ہے جو زمینی اخلاق پر فوقیت رکھتا ہے۔ یہ نہ صرف اخلاقِ فردی و اجتماعی بلکہ قرآن اور دینِ نبوی کو بھی شامل ہے۔ (ر.ک: مکارم شیرازی، ۱۳۷۴ش: ج۲۴، ص۳۷۱؛ مغنیہ، ۱۴۲۴ق: ج۷، ص۳۸۷؛ شاذلی، ۱۴۱۲ق: ج۶، ص۳۶۵۸)

ج-حیاتِ طیبہ کی عملی خوبیاں: انسانی حقوق کا لحاظ

جو شخص ایمان رکھتا ہے کہ قیامت کا دن آئے گا اور جو حیاتِ طیبہ کے طریقے پر زندگی گزارتا ہے، وہ فطری طور پر ایسے اعمال انجام دیتا ہے جو اسے آخرت میں دچارِ عذاب نہ کریں۔ مثلاً وہ ناقص یا خراب مال تیار نہیں کرتا، فروخت کے وقت ناپ یا تول میں کمی نہیں کرتا، کیونکہ عیب دار مال کے بدلے میں قیمت لینا منکر (ناجائز) عمل ہے، لہٰذا حرام ہے۔ دوسرے الفاظ میں، کسی کا حق کم دینا دراصل اس کا حق کھانا ہے، اور یہ ظلم کی ایک صورت ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے: «وَيْلٌ لِلْمُطَفِّفِينَ» (المطففین: ۱)، یعنی "کم تولنے والوں کے لیے ہلاکت ہے"۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے لیے جہنم کی وعید سنائی ہے۔ اگلی آیات میں ان کی صفات یوں بیان کی گئی ہیں: «الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ» (المطففین: ۲)، "جو جب اپنے

لیے ناپتے ہیں تو پورا لیتے ہیں"، لیکن جب دوسروں کو دیتے ہیں تو «وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ» (المطففین: ۳)، "جب ان کے لیے ناپتے یا تولتے ہیں تو کمی کرتے ہیں"۔ حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کو اسی بات کی تاکید کی جیسا کہ قرآن میں ہے: «وَيَا قَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ» (سورۂ ہود: ۸۵)، "اے میری قوم! ناپ اور تول انصاف کے ساتھ پورا کرو، لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کرو، اور زمین میں فساد نہ پھیلاؤ۔" اسی طرح اللہ تعالیٰ نے سورۂ اسراء (آیت ۳۵) اور سورۂ شعراء (آیت ۱۸۱) میں بھی صراحت کے ساتھ لوگوں کو حقوق ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ حقوق کی ادائیگی صرف لین دین تک محدود نہیں، بلکہ انسانی زندگی کے تمام تعلقات میں — چاہے وہ افراد کے مابین ہوں یا حکومتوں اور عوام کے درمیان — لازم ہے۔ جو شخص حیاتِ طیبہ میں زندگی بسر کرتا ہے، وہ فطری طور پر الٰہی احکام، اوامر و نواہی سے واقف ہوتا ہے اور آیاتِ الٰہی کے مطالعے اور عمل سے اپنے نفس پر قابو پا لیتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے حق میں بھی عادل ہوتا ہے اور دوسروں کے حقوق کے لحاظ میں بھی پیش پیش رہتا ہے۔ اس کے برعکس، حیاتِ خبیثہ میں ایسی خوبصورتی نظر نہیں آتی۔ وہاں ممکن ہے بعض لوگ صرف اس لیے جھوٹ اور حق تلفی سے بچیں کہ وہ دیرپا نفع یا مستحکم بازار کے خواہاں ہوں، لیکن یہ داخلی معیار کافی نہیں۔ حقوق کی رعایت تب ہی حقیقی کہلائے گی جب وہ جغرافیائی حدود سے باہر بھی برقرار رہے۔ اسی لیے وہ تجارتی و اقتصادی کمپنیاں جو بعض ممالک سے خام مال انتہائی کم قیمت پر خرید کر، انہیں اپنی سائنسی و صنعتی مہارت سے تیار کر کے انہی ممالک کو بہت مہنگے داموں فروخت کرتی ہیں، وہ دراصل صارفین کے حقوق کی رعایت کا دعویٰ نہیں کر سکتیں۔ ایسی کمپنیاں درحقیقت انسانوں کے حقوق پامال کرتی ہیں اور اللہ کے ہاں ان کے لیے سخت سزا ہے۔ لہٰذا، وہ حقوق جو انسانی تعلقات کے مختلف پہلوؤں میں پائے جاتے ہیں — خواہ وہ خاندان کے اندر ہوں، کام کی جگہ پر، دوستوں کے درمیان، پیدا کرنے والے اور استعمال کرنے والے کے درمیان، پیداوار، تقسیم اور استعمال کے مراحل میں، یا عوام اور حکومت کے درمیان — ان تمام صورتوں میں، واحد نظامِ زندگی جس میں مکمل طور پر حقوق کی رعایت کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے، وہ حیاتِ طیبہ ہے۔ البتہ، اس دعوے کا مطلب یہ نہیں کہ عملی طور پر سبھی لوگ

اس پر عمل پیرا ہیں، بلکہ اس لحاظ سے کہ نظری و عقلی طور پر جس نظام میں تمام پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے حقوق کی مکمل رعایت ممکن ہے، وہ وہی حیاتِ طیبہ ہے جس کی طرف قرآنِ کریم انسانوں کو دعوت دیتا ہے۔

ظالم کے مقابلے میں مظلوم کی حمایت

انسانی تاریخ کے آغاز سے ہی دنیا میں ظالم اور مظلوم موجود رہے ہیں۔ ظالم ہمیشہ کوشش کرتا رہا ہے کہ مختلف حیلوں اور تدبیروں کے ذریعے مظلوم کو اس کے جائز حقوق تک پہنچنے سے روک دے، جبکہ مظلوم اپنی تمام تر توانائیاں اپنے حق کے حصول میں صرف کرتا رہا ہے۔ یہ کشمکش اُس وقت تک جاری رہے گی جب تک انسان دنیا میں پیدا ہوتا رہے گا، کیونکہ انسان کی مادی حیثیت منافع کے تصادم اور مفادات کے ٹکراؤ کا سبب بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں ظالم کو "ظالم" اور "مستکبر" دونوں الفاظ سے یاد فرمایا ہے۔ قرآن کی منطق کے مطابق، ظالم اور مستکبر وہ شخص ہے جو اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے اور دوسروں کی طاقت کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ سورۂ اعراف میں فرمایا گیا ہے: «الَّذِينَ يَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَيَبْغُونَهَا عِوَجًا وَهُمْ بِالْآخِرَةِ كَافِرُونَ» (الاعراف: ۴۵)، "وہ لوگ جو (لوگوں کو) اللہ کے راستے سے روکتے ہیں، اور (شک و شبہات ڈال کر) اسے ٹیڑھا دکھانا چاہتے ہیں، اور آخرت کے منکر ہیں۔" قرآن کے بیان کے مطابق، یہ تین صفات — اللہ کی الوہیت سے انکار، انبیاء کی رہنمائی کا انکار، اور قیامت کی حقانیت کا انکار — ظلم کی بنیاد ہیں۔ (طباطبائی، ۱۴۱۷ق: ج ۸، ص ۱۱۸)

حیاتِ طیبہ میں مظلوم کی حمایت ایک بنیادی اصول ہے۔ روزِ قیامت، وہ لوگ جو مظلوموں کی مدد کے لیے نہیں اٹھے، سزا پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ سورۂ انفال میں فرماتا ہے: «... إِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ ...» (الانفال: ۷۲)، "اگر وہ لوگ (یعنی ایمان والے مہاجر) تم سے دین کی خاطر مدد طلب کریں، تو تم پر لازم ہے کہ ان کی مدد کرو۔" یہ آیت نہایت وضاحت کے ساتھ مسلمانوں کو حکم دیتی ہے کہ اگر ان کے دینی بھائی ظلم و ستم کا شکار ہوں، تو ان کی نصرت و حمایت ان پر فرض ہے، تاکہ وہ اپنے دینی و اخلاقی فریضے کو پورا کریں۔ دوسری آیتِ کریمہ میں قرآنِ مجید اُن لوگوں کو سخت تنبیہ اور ملامت کرتا ہے جو مظلوموں کی مدد و حمایت کے معاملے میں خاموشی، بے تفاوتی اور بے حسی اختیار کرتے ہیں، اور ظلم کے خلاف قیام نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: «وَما لَكُمْ لا تُقاتِلُونَ في سَبيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفينَ مِنَ الرِّجالِ وَالنِّساءِ وَالوِلدانِ الَّذينَ

يَقولونَ رَبَّنا أَخرِجنا مِن هذِهِ القَريَةِ الظّالِمِ أَهلُها وَاجعَل لَنا مِن لَدُنكَ وَلِيًّا وَاجعَل لَنا مِن لَدُنكَ نَصيرًا» (النساء: ۷۵)، "تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور اُن مردوں، عورتوں اور بچوں کے حق میں جنگ نہیں کرتے جو (ستمگاروں کے ہاتھوں) کمزور بنا دیے گئے ہیں ـــــ وہی لوگ جو پکار پکار کر کہتے ہیں: اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے نکال جس کے رہنے والے ظالم ہیں، اور اپنے پاس سے ہمارے لیے کوئی سرپرست اور مددگار پیدا فرما!" یہ آیت اس بات پر زور دیتی ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد اور قتال، مظلوموں کو ظالموں کے چنگل سے نجات دینے کے لیے ضروری ہے، جبکہ اُن لوگوں کو ملامت کرتی ہے جو جنگ و جہاد سے پہلو تہی کرتے ہیں اور ظلم کے خلاف خاموش رہتے ہیں۔ (ثعلبی، ۱۴۲۲ق: ج۳، ص۳۴۴؛ طیب، ۱۳۷۸ق: ج۴، ص۱۳۵)

البتہ، قرآنِ کریم کی روشنی میں ہر مظلوم حق پر نہیں ہوتا، کیونکہ بعض اوقات انسان اپنی مرضی سے ایسے حالات قبول کر لیتا ہے جو اسے مظلوم بناتے ہیں۔ ایسی مظلومیت کی کوئی قدر و قیمت نہیں، کیونکہ یہ خود اختیاری ہوتی ہے۔ لہٰذا حیاتِ طیبہ میں صرف حقیقی مظلوم کی حمایت کی جاتی ہے، جبکہ مظلوم نما اور ظلم پرور افراد کا مقابلہ کیا جاتا ہے تاکہ معاشرے میں ظلم و مظلومیت کی فضا پیدا نہ ہو۔ مثلاً، اللہ تعالیٰ سورۂ نساء میں فرماتا ہے: «إِنَّ الَّذينَ تَوَفّاهُمُ المَلائِكَةُ ظالِمي أَنفُسِهِم قالوا فيمَ كُنتُم قالوا كُنّا مُستَضعَفينَ فِي الأَرضِ قالوا أَلَم تَكُن أَرضُ اللَّهِ واسِعَةً فَتُهاجِروا فيها فَأُولئِكَ مَأواهُم جَهَنَّمُ وَساءَت مَصيراً» (النساء: ۹۷)، "جن لوگوں کی روحیں فرشتوں نے قبض کیں جبکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے، فرشتوں نے ان سے پوچھا: تم کس حال میں تھے؟ وہ بولے: ہم تو زمین میں کمزور اور دبا ہوا طبقہ تھے۔ فرشتوں نے کہا: کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم (اس ماحول سے نکل کر) ہجرت کر جاتے؟ تو ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ بہت ہی برا انجام ہے۔" یہ آیت اُن لوگوں پر حجت قائم کرتی ہے جو مظلوم ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہیں، لیکن ان کے پاس ماحولِ غیر اسلامی سے نکل کر اسلامی فضا میں ہجرت کرنے کی قدرت موجود ہوتی ہے، پھر بھی وہ سستی اور بے عملی اختیار کرتے ہیں۔ امیر المؤمنین حضرت علیؑ نے فرمایا: «العامِلُ بِالظُّلمِ وَالرّاضي بِهِ وَالمُعينُ عَلَيهِ شُرَكاءُ ثَلاثَةٌ» "جو شخص ظلم کرتا ہے، جو ظلم پر راضی ہوتا ہے، اور جو ظالم کی مدد کرتا ہے ـــــ یہ تینوں ظلم میں شریک ہیں۔" (حرّ عاملی، ۱۴۰۹ق: ج۱۶، ص۱۴۰)

اس آیت اور اصول کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ حیاتِ طیبہ میں ظلم یا مظلوم پروری کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ نظام کسی کو یہ موقع نہیں دیتا کہ وہ دوسروں پر ظلم کرے، اور اگر کرے تو اس کا محاسبہ ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ کسی کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ خود کو عاجز اور کمزور بنا کر دوسروں کے ظلم کو قبول کرے۔ اس لیے حیاتِ طیبہ وہ زندگی ہے جس میں انسانوں کو مسلسل کوشش، محنت اور بیداری کی تلقین کی جاتی ہے، اور سستی، غفلت اور کم ہمتی سے منع کیا جاتا ہے۔ یہاں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حیاتِ طیبہ میں مؤمن کی روح، فولاد کی مانند مضبوط ہوتی ہے۔ ایسا انسان کبھی بھی ظلم و ستم کو قبول نہیں کرتا اور نیکی و عملِ صالح میں غیر معمولی ثابت قدمی اور استقامت رکھتا ہے۔ استاد مطہریؒ اس بارے میں لکھتے ہیں: "اقبال کا ایک نہایت خوبصورت جملہ ہے جو بظاہر موسولینی کے ایک قول کے مقابلے میں کہا گیا ہے۔ موسولینی کہتا ہے: 'جس کے پاس لوہا ہے، وہی روٹی رکھتا ہے' یعنی اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے پاس روزی ہو تو تمہیں طاقت، اسلحہ اور زور حاصل کرنا ہوگا۔ لیکن اقبال کہتا ہے: 'جو خود لوہا ہے، وہی روٹی رکھتا ہے' — موسولینی مادی اسلحے اور ظاہری طاقت پر تکیہ کرتا ہے، جبکہ اقبال روحانی قوت پر۔ اقبال کا مطلب یہ ہے کہ جس کی روح خود لوہے کی طرح مضبوط ہو، وہی کامیاب اور باعزت زندگی پاتا ہے۔" امیر المؤمنین حضرت علیؑ نے فرمایا: «نَفْسُ الْمُؤْمِنِ أَصْلَبُ مِنَ الصَّلْدِ» یعنی "مؤمن کی روح، چٹان سے بھی زیادہ سخت و محکم ہے۔" (کلینی، ۱۳۶۵ق: ج۲، ص۲۲۷) اقبال کا مقصود بھی یہی ہے کہ روح مؤمن، فولاد ہے — اور ان تمام تعبیرات کا مطلب ایک ہی ہے: اسلام انسان کو قوت، پائیداری اور روحانی طاقت کی دعوت دیتا ہے۔ (مطہری، ۱۳۶۷ق: ص ۲۳۵) یہ حدیث اس بات کی علامت ہے کہ مؤمن اپنے ربّ کے ساتھ کیے ہوئے عہد و میثاق میں انتہائی صابر، ثابت قدم اور وفادار ہوتا ہے، اور کسی حال میں حق سے انحراف نہیں کرتا۔

عوام کا پسندیدہ اور رضامندانہ نظام

حکومت اور اقتدار انسانی زندگی کے سماجی پہلو کا بنیادی موضوع ہے۔ چونکہ انسان فطری طور پر معاشرتی زندگی کا محتاج ہے، اس لیے اسے نظم و نسق کے لیے ایک نظامِ حکومت درکار ہوتا ہے۔ یہ سوال کہ "انسان پر حکومت کا حق کس کو حاصل ہے؟" — تاریخ بشر میں ہمیشہ بحث و اختلاف کا مرکز رہا ہے۔ ہر دین اور ہر مکتبِ فکر نے اس بارے میں اپنا مخصوص نظریہ پیش کیا ہے۔ یہودیت اور عیسائیت میں حکومت کسی ایسے انسان کے

سپرد کی گئی جو لوگوں کے معاملات کو منظّم اور ان کی معاشرت کو سنوار سکے، جبکہ مادی و انسانی مکاتبِ فکر — جیسے اومانیسم (Humanism) اور وجودیت — (Existentialism) جن کی بنیاد دنیاوی نفع اور مادی مفاد پر ہے، انھوں نے اقتدار اُن لوگوں کے حوالے کیا جو علم، صنعت یا فوجی طاقت کے ذریعے زر و زور کے مالک ہوں، تاکہ وہ انسان کو مادی عزت و مقام دے سکیں۔ اس کے برعکس، اسلامی حیاتِ طیبہ میں حکومت و اقتدار کو صرف اللہ تعالیٰ کی ملکیت قرار دیا گیا ہے۔

اسلام کی جامعیت کے پیشِ نظر، جہاں سورۂ نساء (آیت ٦٠) کے مطابق طاغوت کی طرف رجوع ممنوع ہے، وہیں سورۂ نساء (آیت ۵۸) میں انبیاء کو حکومت میں دخل کا حق دیا گیا ہے اور سورۂ حدید (آیت ۲۵) کے مطابق انسانی زندگی میں الٰہی قوانین کا نفاذ ضروری ہے۔ قرآن کے اس اصول کے مطابق کہ معاشرے میں حق کا معیار اکثریت یا اقلیت نہیں بلکہ ایمان، تقویٰ اور عملِ صالح ہے، ان بنیادوں پر وہی شخص حکومت کا حقدار ہے جس کی روح، روحِ الٰہی سے زیادہ قرب، تعلق اور ہم آہنگی رکھتی ہو۔ (ر.ک: جوادی آملی، شریعت در آئینہ معرفت؛ مصباح یزدی، حکومت اسلامی و ولایت فقیہ؛ محمدی ری شہری، رہبری در اسلام) اسی بنا پر، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور وہ ائمہ علیہم السلام جن کی ارواح براہِ راست روحِ الٰہی سے متصل ہیں، لوگوں پر حکومت کا حقیقی حق رکھتے ہیں۔ اور اگر کوئی انسان واقعی مومن ہو — یعنی خدا، نبوت اور معاد پر سچا ایمان رکھتا ہو، اور محض زبانی نہیں بلکہ عملی طور پر الٰہی احکام کا پابند ہو — تو وہ بھی دینی حکومت کا اہل بن سکتا ہے۔ چنانچہ زمانۂ غیبت میں، عوام پر حکومت انسان کے جسم کی نہیں بلکہ روحِ انسانی کی ہوتی ہے — وہ روح جو نورِ الٰہی سے منور اور ایمان و تقویٰ سے رنگین ہو۔

سورۂ توبہ کی آیت ٦١ کے مطابق: «وَرَحۡمَةٞ لِّلَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمۡ ۚ وَالَّذِينَ يُؤۡذُونَ رَسُولَ اللَّهِ لَهُمۡ عَذَابٌ أَلِيمٌ» "اور وہ (رسول) تم میں سے ان لوگوں کے لیے رحمت ہیں جو ایمان لائے، اور جو لوگ رسولِ خدا کو اذیت دیتے ہیں، ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔" یہ آیت اُس موقع سے متعلق ہے جب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے منافقین آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر خبریں اور باتیں پیش کیا کرتے تھے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہایت حلم و بردباری کے ساتھ اُن کی باتیں سنتے تھے۔ منافقین نے اس صفتِ اخلاقی کو آپؐ پر عیب کے طور پر پیش کیا اور کہا: "یہ تو ہر ایک کی بات سنتے ہیں!" اللہ تعالیٰ نے ان کی بات کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ

در حقیقت یہ بات نبیِ اکرم صلی‌اللہ‌علیہ‌وآلہ‌وسلم کی اعلیٰ اخلاقی خوبی ہے، نہ کہ عیب۔ یہی نرم خوئی اور سنجیدہ طرزِ سماعت دراصل تمہارے لیے فائدہ مند ہے، کیونکہ وہ تمہاری کمزوریوں کو ظاہر نہیں کرتے، لہٰذا تمہیں ان سے راضی ہونا چاہیے۔ دوسری بات یہ ہے کہ نبیِ اکرم صلی‌اللہ‌علیہ‌وآلہ‌وسلم چونکہ خدا پر کامل ایمان رکھتے ہیں، اسی لیے وہ صرف ان باتوں کو قبول کرتے ہیں جو اہلِ ایمان کے حق میں بہتر ہوں۔ کیونکہ سچے مومنین، جن کا ایمان واقعی و حقیقی ہوتا ہے، نیکی اور خیر کے کاموں میں خطا نہیں کرتے۔ پس جو لوگ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نیکی کے راستے پر گامزن ہیں، وہی نبیِ اکرم صلی‌اللہ‌علیہ‌وآلہ‌وسلم کی تصدیق اور تائید کے مستحق ہوتے ہیں۔ (بیضاوی، ۱۴۱۸ق: ج ۳، ص ۸۶؛ آلوسی، ۱۴۱۵ق: ج ۵، ص ۳۱۶)

یہ بات واضح ہے کہ ایسی الٰہی تائید کی اصل شرط ایمانِ حقیقی ہے ـــــ یعنی مومن گروہ کا ایمان اور عمل، دونوں خدا کے لیے ہوں۔ اس لیے وہ گروہ جو محض دنیاوی مفادات یا مادی منافع کے لیے متحد ہو، اسلامی منطق کے مطابق قابلِ تصدیق یا قابلِ حمایت نہیں ہو سکتا۔ (طباطبائی، ۱۴۱۷ق: ج ۹، ص ۳۱۴؛ صادقی تہرانی، ۱۳۶۵ق: ج ۱۳، ص ۱۹۳) ایمانِ حقیقی کی پہچان بھی اعمال اور آثار سے ہوتی ہے۔ اگر کسی جماعت کا عمل، قرآن کے احکام اور سنتِ نبوی کے مطابق ہو، تو وہ اجتماع ایک الٰہی اور انسانی اتحاد ہے؛ ورنہ ان کا اتحاد و اتفاق ذرّہ برابر بھی اہمیت نہیں رکھتا۔ یہی مفہوم سورۂ عنکبوت کی آیت ۲۶ سے بھی ظاہر ہوتا ہے: «فَآمَنَ لَهُ لُوطٌ وَقَالَ إِنِّي مُهَاجِرٌ إِلَى رَبِّي إِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ» "پس لوط نے ان پر ایمان لایا، اور کہا: میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں، بے‌شک وہی زبردست اور دانا ہے۔" یہاں "لام" کا استعمال اس لیے کیا گیا ہے کہ یہ لفظ تصدیق اور قبولیت کے معنی دیتا ہے۔ یعنی حضرت لوطؑ نے حضرت ابراہیمؑ پر اس لیے ایمان لایا کہ وہ جانتے تھے کہ ابراہیمؑ اللہ کی راہ پر ہیں اور خیر کے کاموں میں سرگرم ہیں، اسی لیے انہوں نے اعلان کیا کہ "میں بھی انہی کی طرح اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں۔" یہ "لام" دراصل استجابت (قبولیت و پیروی) کے مفہوم کو ظاہر کرتا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ سورۂ بقرہ آیت ۱۸۶ میں فرماتا ہے: «فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ» "پس چاہیے کہ وہ میری پکار کو قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں، تاکہ وہ راہِ راست پائیں۔" اس آیت میں "استجابت" کے لیے لام اور ایمان کے لیے باء کا استعمال اسی دقیق نکتہ کی طرف اشارہ ہے۔ (خطیب، تاریخ ندارد: ج ۱۰، ص ۴۲۵)

رہبر معظم انقلاب اسلامی مرحوم امام خمینیؒ کے ایمان کے بارے میں فرماتے ہیں:

"شہید مطہریؒ (رضوان اللہ تعالیٰ علیہ) نے پیرس میں امام سے ایک ملاقات کی تھی۔ خود شہید مطہری ایمان کا پہاڑ تھے، لیکن وہ بھی امام کے ایمان کے سامنے حیران و شگفتہ رہ گئے۔ وہ واپسی کے بعد کہا کرتے تھے کہ میں نے امام میں چار قسم کے ایمان دیکھے: ایک، مقصد پر ایمان — اور وہ مقصد اسلام تھا؛ امام کا ہدف اسلام تھا۔ دوسرا، راہ پر ایمان — یعنی اس راہ پر جو امام نے اختیار کی تھی؛ امام کی راہ، جہاد و مبارزے کی راہ تھی۔ تیسرا، لوگوں پر ایمان — مؤمنین پر اعتماد؛ وہی بات جو قرآن کریم میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں فرمائی گئی ہے: «يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ يُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِينَ» (یعنی وہ اللہ پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور مؤمنوں پر بھی اعتماد کرتے ہیں)۔ اور چوتھا، جو سب سے بلند ہے، ایمان باللہ — خدا پر ایمان اور اس پر کامل اعتماد۔ «يُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِينَ» کا درست مطلب بھی یہی ہے کہ «یؤمن بالمؤمنین» یعنی لوگوں پر اعتماد رکھنا۔ قرآنِ کریم میں لفظ 'ایمان' کبھی 'لام' کے ساتھ استعمال ہوا ہے، جیسے «فَآمَنَ لَهُ لُوطٌ»۔ پس «يُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِينَ» کا مطلب ہے لوگوں پر اعتماد اور ان پر یقین۔"

(رسم آیہ ہا، ایمان و امید امام خمینی، ۱۴۰۲/۳/۱۶، https://khl.ink/f/53069)

انسانی زندگی میں معنویت کے ذریعے امن پیدا کرنا

جس طرح انسانی جسم پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، اسی طرح انسانی روح بھی معنویت کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتی۔ معنویت انسان کے لیے وہی حیثیت رکھتی ہے جو پانی جسم کے لیے رکھتا ہے۔ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ معنویت ہمیشہ انسان کی حیات کے ساتھ رہی ہے — ماضی میں بھی، حال میں بھی اور مستقبل میں بھی۔ لہٰذا، معنویت کو انسانی زندگی کے دائرے سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ حیاتِ طیبہ میں ہر طرح کی معنویت قابلِ قبول نہیں۔ اسلامی حیاتِ طیبہ میں وہی معنویت معتبر ہے جو سماجی میدان میں مؤثر، فعال اور نتیجہ خیز ہو۔ درست ہے کہ انسانی زندگی میں جھوٹے اور سطحی عرفان (کاذب تصوف) ماضی میں بھی پائے گئے ہیں اور آئندہ بھی پائے جائیں گے، لیکن ایسے تصوف و عرفان جو حقیقت سے خالی اور سطحی ہوں، قرآن کے نزدیک قابلِ قبول نہیں۔ اسی طرح وہ عرفان یا روحانیت بھی قابلِ قبول نہیں جو صرف انفرادی ہو اور جس کا ظہور صرف ذاتی زندگی میں ہو — جیسے عیسائی راہبوں کی زندگی جو معاشرے سے کٹ کر گزارتے ہیں، یا وہ صوفی و عارف جو اسلامی ماحول میں رہتے ہوئے بھی سماجی و اجتماعی سرگرمیوں میں کوئی کردار ادا نہیں کرتے۔ (یثربی،

۱۳۸۷ش: ص۶۷؛ نیز، ۱۳۸۶ش: ص۱۲۲) اسی طرح وہ عرفان جو شریعت سے بے تعلق ہو، یا شریعت کے ان پہلوؤں کو جو اجتماعی امور جیسے جہاد، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے متعلق ہیں، اہمیت نہ دے، وہ بھی اسلام کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ (یثربی، ۱۳۸۴ش: ص۸۵)

اسلام اور قرآن کی اس مخالفت کی وجہ یہ ہے کہ دینِ اسلام اپنی جامع اور دائمی صورت میں اس لیے نازل ہوا کہ وہ نہ صرف انسان کی انفرادی زندگی بلکہ اس کی اجتماعی زندگی کو بھی منظّم اور متوازن بنائے۔ اگر انسان کا ذاتی پہلو درست ہو جائے مگر اس کی اجتماعی زندگی بگاڑ کا شکار رہے، اور معاشرہ آلودگی و بداعمالی میں مبتلا ہو جائے، تو ایسی انفرادی پاکیزگی محض عارضی ہوگی، جو جلد ہی سماجی اثرات کے زیرِ اثر ختم ہو جائے گی یا بہت کمزور اور ناقص رہ جائے گی۔ کیونکہ دینِ اسلام میں صرف عارضی گوشہ نشینی کو قبول کیا گیا ہے، جیساکہ قرآنِ کریم کی آیت میں فرمایا گیا ہے: «...ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيامَ إِلَى اللَّيْلِ وَ لا تُباشِرُوهُنَّ وَ أَنْتُمْ عاكِفُونَ فِي الْمَساجِدِ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلا تَقْرَبُوها كَذلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آياتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ» "پھر روزے کو رات تک مکمل کرو، اور جب تم مسجدوں میں اعتکاف کی حالت میں ہو تو اپنی بیویوں سے مباشرت نہ کرو۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں، پس ان کے قریب نہ جاؤ۔ اللہ یوں ہی اپنی آیات لوگوں کے لیے واضح کرتا ہے تاکہ وہ پرہیزگار بن جائیں۔" (سورۂ بقرہ، آیت ۱۸۷) یہ ایسی خلوت گزینی ہے جو انسان کو باکردار، باارادہ اور قہرمان بناتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص زندگی سے کٹ جائے، یا معاشرتی و اجتماعی امور—جیسے دفاع، انتخابات اور دیگر عوامی مسائل—سے لاتعلق رہے، تو ایسا عرفان و تصوف ناقص اور غیر مؤثر ہے۔ (میبدی، ۱۳۷۱ھ ش: ج۱، ص۵۰۷) للذا، اگرچہ مغربی دنیا میں آزادی اور مشرقی دنیا میں عدالت کے نعرے گونج رہے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی حقیقی کامیابی کی راہ نہیں دکھا سکتا، کیونکہ جب تک الہیٰ معنویت اور خدا کی محبت ان دونوں میدانوں میں غالب نہ ہو جائے اور زندگی کے تمام پہلوؤں پر حکمرانی نہ کرے، انسان کے دکھوں کا علاج ممکن نہیں۔ مراد عشقِ الہی اور معنویت سے یہ ہے کہ انسان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے واقعات میں خدا کی طرف رجوع کرے۔ جب انسان اپنی ذاتی اور اجتماعی زندگی کو الہیٰ ارادوں اور احکام کے مطابق ڈھال لیتا ہے، اور اپنی نفسانی خواہشات پر خدا کی مرضی کو ترجیح دیتا ہے، تب اس کے وجود میں خدا کی محبت اور روحانی حرارت بھڑک اٹھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سورۂ ذاریات کی آیت ۵۰ میں ارشاد فرماتا ہے: «فَفِرُّوا إِلَى اللَّهِ إِنِّي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ مُبِينٌ» "پس اللہ کی طرف

بھاگ آؤ، بے شک میں تمہارے لیے اس کی طرف سے ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ " یہ آیت انسان کو اس بات کا حکم دیتی ہے کہ وہ گناہ سے اطاعت کی طرف، انحراف اور جہالت سے علم و ہدایت کی طرف، اور عذاب و غضبِ الٰہی سے رحمت و رضوانِ الٰہی کی طرف قدم بڑھائے۔ (تستری، ۱۴۲۳ق: ج۱، ص ۱۵۴) یقیناً، یہاں "اللہ کی طرف بھاگنے" کا مفہوم سماجی زندگی سے کنارہ کشی نہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان الہٰی احکام کی روشنی میں معاشرے میں سر گرم رہے اور اپنی سماجی و اجتماعی ذمہ داریوں کو خدا کے حکم کے مطابق انجام دے۔

حیاتِ طیبہ کا کردار اور اس کا انسانی طرزِ زندگی پر اثر

حیاتِ طیبہ ایک قرآنی اصطلاح ہے جو ایسی پاکیزہ اور پسندیدہ زندگی کی طرف اشارہ کرتی ہے جو ایمان اور عملِ صالح سے جنم لیتی ہے۔ یہ اصطلاح قرآنِ کریم میں صرف ایک مرتبہ (سورۂ نحل، آیت ۹۷) آئی ہے، مگر اس کا اثر انسانی طرزِ زندگی پر نہایت گہرا ہے۔ حیاتِ طیبہ نہ صرف اخروی زندگی کی نشاندہی کرتی ہے بلکہ دنیاوی زندگی میں بھی جلوہ گر ہوتی ہے، اور یہی تصور اسلامی طرزِ زندگی (Islamic Lifestyle) کی بنیاد ہے۔ (کریم پور قراملکی، ۱۴۰۳ق: ص ۳۵ و بعد) حیاتِ طیبہ کے اثرات فردی و خاندانی سطح پر نمایاں ہوتے ہیں۔ انفرادی زندگی میں، یہ ایمان باللہ اور توکل علی اللہ کے ذریعے نفسیاتی سکون فراہم کرتی ہے، کیونکہ قرآن کے مطابق، "دلوں کو اللہ کے ذکر سے ہی اطمینان حاصل ہوتا ہے۔" یہ زندگی میں قناعت کے جذبے کو فروغ دے کر انسان کو حرص و طمع سے بچاتی ہے اور اسے مقصدیت عطا کر کے بے معنویت اور پوچی سے نجات دیتی ہے۔ ایک مومن اپنی زندگی کو قربِ الٰہی کے سفر کے طور پر دیکھتا ہے۔ اسی طرح، خاندان پر بھی حیاتِ طیبہ کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں، جو معاشرے کی بنیادی اکائی ہے۔ یہ صدق و احترامِ باہمی پر زور دے کر خاندانی رشتوں کو مضبوط بناتی ہے۔ جو والدین اس کے اصولوں پر عمل پیرا ہوتے ہیں، وہ باایمان، بااخلاق اور ذمہ دار اولاد کی تربیت کرتے ہیں جو مستقبل میں معاشرے کے لیے مفید ثابت ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ، قناعت اور رضامندی کی روح مالی اختلافات اور گھریلو کشیدگیوں کو کم کر کے خاندانی امن کو فروغ دیتی ہے۔

حیاتِ طیبہ سماجی اور اقتصادی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر گہرے اور مثبت اثرات مرتب کرتی ہے۔ سماجی سطح پر یہ تصور معاشرتی زندگی کے مختلف میدانوں میں تبدیلی اور تطہیر پیدا کرتا ہے، جس سے اجتماعی نظم، تعاون اور الٰہی اقدار پر مبنی سماجی نظام تشکیل پاتا ہے۔ یہ عدل و انصاف پر زور دے کر معاشرے میں ظلم،

ناانصافی اور امتیازات کے خاتمے میں مدد فراہم کرتی ہے۔ ایمان اور عملِ صالح انسانوں کو ایک دوسرے کی مدد کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور اجتماعی تعاون کے جذبے کو مضبوط کرتا ہے۔ اسی طرح، حیاتِ طیبہ اخلاقی اقدار جیسے صداقت، دیانت اور امانت داری کو فروغ دے کر معاشرتی تعلقات کی صحت اور پائیداری کو یقینی بناتی ہے۔

اقتصادی میدان میں بھی حیاتِ طیبہ گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ یہ انسان کو حلال روزی کے حصول کی ترغیب دیتی ہے اور حرام ذرائع سے اجتناب پر آمادہ کرتی ہے، جس سے معاشرے کا اقتصادی نظام پاکیزہ اور مضبوط ہوتا ہے۔ حیاتِ طیبہ قناعت کے جذبے کو فروغ دیتی ہے، جس کے نتیجے میں انسان وسائل کے استعمال میں میانہ روی اختیار کرتا ہے اور اسراف و فضول خرچی سے بچتا ہے۔ مزید برآں، یہ تصور انسان کو انفاق اور ضرورت مندوں کی مدد پر آمادہ کرتا ہے، جس سے غربت میں کمی اور طبقاتی تفاوت (معاشرتی خلیج) کا خاتمہ ممکن ہوتا ہے۔

یہ تمام نکات اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ حیاتِ طیبہ ایک قرآنی تصور کے طور پر انسان کے طرزِ زندگی کو تشکیل دینے میں بنیادی اور کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ یہ تصور، ایمان اور عملِ صالح پر زور دے کر انسانی زندگی کے انفرادی، خاندانی، سماجی اور معاشی تمام پہلوؤں کو متاثر کرتا ہے، اور انسان کی زندگی میں سکون، مقصدیت اور معنویت پیدا کرتا ہے۔ آخرکار، حیاتِ طیبہ نہ صرف فردی سعادت کا ذریعہ بنتی ہے، بلکہ ایک عادلانہ، متوازن اور روحانی معاشرے کے قیام میں بھی مددگار ثابت ہوتی ہے۔

خاتمہ

مندرجہ بالا مباحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حیاتِ طیبہ ہی وہ واحد طرزِ حیات ہے جو انسان کو اس کی انسانی اور الٰہی حقیقت سے روشناس کراتی ہے اور اس کے عقیدتی، روحانی اور عملی پہلوؤں پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ فکری سطح پر اس کی خوبصورتیوں میں غیبی حقائق کی معرفت، انسان کی صفات کی شناخت، اور انسانی فکر کے دائرے کی وسعت شامل ہے۔ اس کے روحانی اثرات انسانوں کے درمیان محبت کے استحکام، خدا اور اس کی مخلوق سے عشق میں پائیداری، اور ایک جاویدانی و عالمی نمونۂ حیات کے قیام کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ عملی میدان میں اس کے جلوے انسانی حقوق کی پاسداری، مظلوم کی حمایت اور ظالم کے خلاف

قیام، جمہوریت اور مردم سالاری کی رعایت، اور معنویت کے ذریعے معاشرتی امن کے فروغ کی شکل میں نظر آتے ہیں۔

آخر میں، حیاتِ طیبہ انسانی طرزِ زندگی پر ایک جامع اور گہرا اثر ڈالتی ہے۔ یہ انسان کو پوچی اور بے معنویت سے نجات دیتی ہے اور اس کی زندگی کو معنی، سکون اور توازن عطا کرتی ہے۔ ایسی زندگی نہ صرف فرد اور معاشرے کی سلامتی کی ضامن بنتی ہے بلکہ انہیں اخلاقی و روحانی انحرافات سے بھی محفوظ رکھتی ہے۔

کتابیات

قرآن مجید

۱. ابن منظور. (۱۴۰۸ق). لسان العرب. دار احیاء التراث العربی.

۲. آلوسی، سید محمود. (۱۴۱۵ق). روح المعانی فی تفسیر القرآن. دار الکتب العلمیة.

۳. بیضاوی، عبداللہ بن عمر. (۱۴۱۸ق). انوار التنزیل واسرار التأویل. دار احیاء التراث العربی.

۴. تستری، ابو محمد سہل بن عبداللہ. (۱۴۲۳ق). تفسیر التستری. دار الکتب الإسلامیة.

۵. ثعلبی نیشابوری، ابواسحاق. (۱۴۲۲ق). الکشف والبیان فی تفسیر القرآن. دار احیاء التراث العربی.

۶. حر عاملی، محمد بن حسن. (۱۴۰۹ق). وسائل الشیعة إلی تحصیل مقاصد الشریعة (چاپ اول). مؤسسة آل البیت علیہم السلام.

۷. حطیط، حسن. (۲۰۰۵م). الإعجاز العلمی فی القرآن الکریم. دار ومکتبة الھلال.

۸. خطیب، عبدالکریم. (بی تا). التفسیر القرآنی للقرآن. دار الفکر العربی.

۹. راغب اصفہانی، حسین بن محمد. (۱۴۱۲ق). المفردات فی غریب القرآن. دار العلم.

۱۰. زمخشری، محمود بن عمر. (۱۴۰۷ق). الکشاف عن حقائق التنزیل. دار الکتاب العربی.

۱۱. شاذلی، سید بن قطب بن ابراہیم. (۱۴۱۸ق). فی ظلال القرآن. دار الشروق.

۱۲. صادقی تہرانی، محمد. (۱۳۶۵ش). تفسیر الفرقان (چاپ دوم). انتشارات فرہنگ اسلامی.

۱۳. طباطبایی، سید محمد حسین. (۱۴۱۷ق). المیزان فی تفسیر القرآن. جامعة المدرسین.

۱۴. طبرسی، فضل بن حسن. (۱۳۷۲ش). مجمع البیان. انتشارات ناصر خسرو.

۱۵. طوسی، محمد بن حسن. (بی تا). التبیان فی تفسیر القرآن. دار احیاء التراث العربی.

۱۶. طیب، سید عبدالحسین. (۱۳۷۸ش). اطیب البیان فی تفسیر القرآن. انتشارات اسلام.

۱۷. فخر رازی، محمد بن عمر. (۱۴۲۰ق). مفاتیح الغیب. دار احیاء التراث العربی.

۱۸. فراہیدی، خلیل بن احمد. (۱۴۲۰ق). العین. اسوہ.

۱۹. فضل اللہ، سید محمد حسین. (۱۴۱۹ق). من وحی القرآن. دار الملاک.

۲۰. فیض کاشانی، ملا محسن. (۱۴۱۵ق). تفسیر الصافی. الصدر.

۲۱. فیومی، احمد بن محمد. (۱۳۹۷ق). المصباح المنیر. دار الہجرة.

۲۲. قرشی، سید علی اکبر. (۱۳۷۸ش). تفسیر احسن الحدیث. بنیاد بعثت.

۲۳. قمی مشهدی، محمد بن محمد رضا. (۱۳۶۸ش). تفسیر کنز الدقائق و بحر الغرائب (چاپ اول). وزارت فرہنگ و ارشاد اسلامی.
۲۴. کریم پور قراملکی، علی. (۱۴۰۰ش). «بررسی تعارض قرآن و علم از واقعیت تا توہم». فصلنامہ قرآن و علم، (۲۸).
۲۵. کریم پور قراملکی، علی. (۱۴۰۲ ش). تأملی در تفسیر علمی قرآن. ادباء.
۲۶. کریم پور قراملکی، علی. (۱۴۰۳ ش). سیمای حیات طیبہ در قرآن. ادباء.
۲۷. کلینی، محمد بن یعقوب. (۱۳۶۵ش). اصول کافی (چاپ چہارم). دار الکتب الإسلامیة.
۲۸. مطہری، مرتضی. (۱۳۶۷ش). انسان کامل. صدرا.
۲۹. مغنیہ، محمد جواد. (۱۴۲۴ق). الکاشف فی تفسیر القرآن. دار الکتاب الإسلامی.
۳۰. مکارم شیرازی، ناصر و ہمکاران. (۱۳۷۱ش). تفسیر نمونہ. دار الکتب الإسلامیة.
۳۱. میبدی، احمد بن محمد. (۱۳۷۱ش). کشف الأسرار و عدة الأبرار. انتشارات امیر کبیر.
۳۲. یثربی، سید یحییٰ. (۱۳۸۴ش). عرفان و شریعت. پژوہشگاہ فرہنگ و اندیشہ اسلامی.
۳۳. یثربی، سید یحییٰ. (۱۳۸۶ش). پژوہشی در نسبت دین و عرفان. پژوہشگاہ فرہنگ و اندیشہ اسلامی.
۳۴. یثربی، سید یحییٰ. (۱۳۸۷ش). عرفان نظری (چاپ ششم). بوستان کتاب.
۳۵. رسم آیہ ہا، ایمان و امید امام خمینی، ۱۴۰۲/۳/۱۶، https://khl.ink/f/53069

Sources

Al-Qurʾān al-Karīm.
1. Al-Bayḍāwī, ʿAbd Allāh ibn ʿUmar. (1418 AH / 1997 CE). Anwār al-Tanzīl wa Asrār al-Taʾwīl (The Lights of Revelation and the Secrets of Interpretation). Dār Iḥyāʾ al-Turāth al-ʿArabī.
2. Al-Farāhīdī, Khalīl ibn Aḥmad. (1420 AH / 1999 CE). Al-ʿAyn (The Lexicon of "ʿAyn"). Uswah.
3. Al-Fayyūmī, Aḥmad ibn Muḥammad. (1397 AH / 1977 CE). Al-Miṣbāḥ al-Munīr (The Illuminating Lexicon). Dār al-Hijrah.
4. Al-Ḥurr al-ʿĀmilī, Muḥammad ibn al-Ḥasan. (1409 AH / 1989 CE). Wasāʾil al-Shīʿa ilā Taḥṣīl Maqāṣid al-Sharīʿa (Means of the Shīʿa to Attaining the Purposes of the Sharīʿa) (1st ed.). Muʾassasat Āl al-Bayt (ʿa).
5. Al-Khaṭīb, ʿAbd al-Karīm. (n.d.). Al-Tafsīr al-Qurʾānī lil-Qurʾān (The Qurʾānic Interpretation of the Qurʾān). Dār al-Fikr al-ʿArabī.

6. Al-Kulaynī, Muḥammad ibn Yaʿqūb. (1365 SH / 1986 CE). Uṣūl al-Kāfī (The Principles of al-Kāfī) (4th ed.). Dār al-Kutub al-Islāmiyyah.
7. Al-Rāghib al-Iṣfahānī, Ḥusayn ibn Muḥammad. (1412 AH / 1991 CE). Al-Mufradāt fī Gharīb al-Qurʾān (Lexical Definitions of Rare Qurʾānic Words). Dār al-ʿIlm.
8. Al-Shādhilī, Sayyid Quṭb ibn Ibrāhīm. (1418 AH / 1997 CE). Fī Ẓilāl al-Qurʾān (In the Shade of the Qurʾān). Dār al-Shurūq.
9. Al-Ṭabāṭabāʾī, Sayyid Muḥammad Ḥusayn. (1417 AH / 1996 CE). Al-Mīzān fī Tafsīr al-Qurʾān (The Balance in the Exegesis of the Qurʾān). Jāmiʿat al-Mudarrisīn.
10. Al-Ṭabrisī, Faḍl ibn Ḥasan. (1372 SH / 1993 CE). Majmaʿ al-Bayān fī Tafsīr al-Qurʾān (The Compilation of Clarification in Qurʾānic Exegesis). Nāṣir Khosrow Publications.
11. Al-Ṭayyib, Sayyid ʿAbd al-Ḥusayn. (1378 SH / 1999 CE). Aṭyab al-Bayān fī Tafsīr al-Qurʾān (The Purest Clarification in Qurʾānic Exegesis). Islām Publications.
12. Al-Thaʿlabī al-Nīsābūrī, Abū Isḥāq. (1422 AH / 2001 CE). Al-Kashf wa al-Bayān fī Tafsīr al-Qurʾān (The Unveiling and Clarification in Qurʾānic Exegesis). Dār Iḥyāʾ al-Turāth al-ʿArabī.
13. Al-Ṭūsī, Muḥammad ibn al-Ḥasan. (n.d.). Al-Tibyān fī Tafsīr al-Qurʾān (The Elucidation in the Interpretation of the Qurʾān). Dār Iḥyāʾ al-Turāth al-ʿArabī.
14. Al-Tustarī, Abū Muḥammad Sahl ibn ʿAbd Allāh. (1423 AH / 2002 CE). Tafsīr al-Tustarī (The Exegesis of al-Tustarī). Dār al-Kutub al-Islāmiyyah.
15. Ālūsī, Sayyid Maḥmūd. (1415 AH / 1994 CE). Rūḥ al-Maʿānī fī Tafsīr al-Qurʾān (The Spirit of Meanings in the Exegesis of the Qurʾān). Dār al-Kutub al-ʿIlmiyyah.
16. Al-Zamakhsharī, Maḥmūd ibn ʿUmar. (1407 AH / 1987 CE). Al-Kashshāf ʿan Ḥaqāʾiq al-Tanzīl (The Revealer of the Realities of Revelation). Dār al-Kitāb al-ʿArabī.
17. Faḍl Allāh, Sayyid Muḥammad Ḥusayn. (1419 AH / 1998 CE). Min Waḥy al-Qurʾān (From the Inspiration of the Qurʾān). Dār al-Malāk.
18. Fakhr al-Rāzī, Muḥammad ibn ʿUmar. (1420 AH / 1999 CE). Mafātīḥ al-Ghayb (Keys to the Unseen). Dār Iḥyāʾ al-Turāth al-ʿArabī.

19. Fayḍ Kāshānī, Mullā Muḥsin. (1415 AH / 1994 CE). Tafsīr al-Ṣāfī (The Pure Exegesis). al-Ṣadr.
20. Ḥuṭayṭ, Ḥasan. (2005 CE). Al-Iʿjāz al-ʿIlmī fī al-Qurʾān al-Karīm (The Scientific Miracles in the Noble Qurʾān). Dār wa Maktabat al-Hilāl.
21. Ibn Manẓūr, Abū al-Faḍl Jamāl al-Dīn Muḥammad ibn Mukarram. (1408 AH / 1988 CE). Lisān al-ʿArab (The Tongue of the Arabs). Dār Iḥyāʾ al-Turāth al-ʿArabī.
22. Karīmpūr Qarāmalakī, ʿAlī. (1400 SH / 2021 CE). “A Study of the Alleged Conflict between the Qurʾān and Science: From Reality to Illusion.” Qurʾān and Science Quarterly, (28).
23. Karīmpūr Qarāmalakī, ʿAlī. (1402 SH / 2023 CE). Taʾammulī dar Tafsīr ʿIlmī-yi Qurʾān (Reflections on the Scientific Interpretation of the Qurʾān). Adabāʾ.
24. Karīmpūr Qarāmalakī, ʿAlī. (1403 SH / 2024 CE). Sīmā-yi Ḥayāt Ṭayyibah dar Qurʾān (The Image of the Goodly Life in the Qurʾān). Adabāʾ.
25. Makārem Shīrāzī, Nāṣir, et al. (1371 SH / 1992 CE). Tafsīr al-Namūna (The Exemplary Exegesis). Dār al-Kutub al-Islāmiyyah.
26. Maybudī, Aḥmad ibn Muḥammad. (1371 SH / 1992 CE). Kashf al-Asrār wa ʿUddat al-Abrār (Unveiling the Secrets and the Provision of the Pious). Amīr Kabīr Publications.
27. Mughnīyah, Muḥammad Jawād. (1424 AH / 2003 CE). Al-Kāshif fī Tafsīr al-Qurʾān (The Discoverer in Qurʾānic Interpretation). Dār al-Kitāb al-Islāmī.
28. Muṭahharī, Murtaḍā. (1367 SH / 1988 CE). Insān-e Kāmel (The Perfect Man). Ṣadrā Publications.
29. Qummī Mashhadī, Muḥammad ibn Muḥammad Riḍā. (1368 SH / 1989 CE). Tafsīr Kanz al-Daqāʾiq wa Baḥr al-Gharāʾib (The Treasury of Subtleties and the Sea of Wonders) (1st ed.). Ministry of Culture and Islamic Guidance.
30. Qurashī, Sayyid ʿAlī Akbar. (1378 SH / 1999 CE). Tafsīr Aḥsan al-Ḥadīth (The Best of Narrations). Baynat Baʿthat Foundation.
31. Ṣādiqī Tehrānī, Muḥammad. (1365 SH / 1986 CE). Tafsīr al-Furqān (The Exegesis of al-Furqān) (2nd ed.). Farhang Islāmī Publications.
32. Yathribī, Sayyid Yaḥyā. (1384 SH / 2005 CE). ʿIrfān wa Sharīʿat (Mysticism and the Sharīʿah). Institute for Culture and Islamic Thought.

33. Yathribī, Sayyid Yaḥyā. (1386 SH / 2007 CE). Pazhūheshī dar Nisbat-e Dīn wa ʿIrfān (A Research on the Relationship between Religion and Mysticism). Institute for Culture and Islamic Thought.
34. Yathribī, Sayyid Yaḥyā. (1387 SH / 2008 CE). ʿIrfān-e Naẓarī (Theoretical Mysticism) (6th ed.). Bustān-e Kitāb.
35. The Drawing of the Verses, Faith and Hope of Imam Khomeini Dated: 16/03/1402 SH (6 June 2023 CE). Link: https://khl.ink/f/53069